ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.3 (2026)
(July to September)

جون: مثالیے کی تلاش میں

Jaun: In Quest of the Ideal

ڈاکٹر احمد ولی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جامعہ پشاور، پشاور
بہار علی
بی ایس سکالر، شعبہ اُردو، جامعہ پشاور، پشاور
اقرا جہانزیب
بی ایس سکالر، شعبہ اُردو، جامعہ پشاور، پشاور

Dr. Ahmad Wali
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Peshawar, Peshawar
Bahar Ali
B.S Scholar, Department of Urdu, University of Peshawar, Peshawar
Iqra Jehanzeb (Corresponding Author)
B.S Scholar, Department of Urdu, University of Peshawar, Peshawar

Abstract:
This article explores the quest for the ideal in Jaun Elia's poetry, examining how his longing for love, intellectual certainty, and meaningful existence encounters disillusionment and doubt. Through close textual reading, the study considers the ideal as an imagined possibility against which the poet evaluates both personal experience and social reality. It focuses on the tensions between desire and fulfilment, self and other, and belonging and estrangement. Particular attention is paid to irony, paradox, negation, and self-questioning as poetic expressions of these tensions. The article argues that Jaun's rejection of received certainties does not necessarily signify the abandonment of aspiration; rather, his scepticism often reveals a persistent attachment to possibilities that remain unrealised. The beloved, the self, and the social world consequently emerge as interconnected sites of longing and critique. Read in this light, Jaun's poetry presents the search for the ideal as an unresolved struggle that sustains both emotional intensity and intellectual inquiry.

Key words: Jaun Elia, Urdu poetry, quest for the ideal, disillusionment, scepticism, alienation.

انسانی فکر اور فلسفے کی تاریخ میں چند اذہان ایسے گزرے ہیں جنھوں نے محض تاریخ کا حصہ بننے پر اکتفانہ کیا، بلکہ خود تاریخ کے دھارے کا رخ متعین کرتے رہے۔ یونانی مفکر افلاطون کا شمار علم و دانش کے انہی عظیم معماروں میں ہوتا ہے۔ اس عظیم ذہن کو دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ڈھائی ہزار برس ہونے کو آئے، مگر آج بھی علم و فلسفے، حسن و حقیقت اور وجود و عدم کی کوئی سنجیدہ بحث اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ افلاطون کی فکری و فلسفیانہ عظمت کی اس سے بڑی دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ بیسویں صدی کے مشہور برطانوی مفکر الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ "مغربی فلسفے کی تمام تر روایت دراصل افلاطون کی تحریروں پر لکھے گئے حاشیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"(۱)

افلاطون کی اس ہمہ گیر اور صدیوں پر محیط عظمت کا سب سے درخشاں پہلو اس کا 'نظریہ اعیان' یا مثالیت پسندی (Theory of Forms / Idealism) ہے۔ افلاطون کائنات اور وجود کو اک نرالے اور اچھوتے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ اس کے نظریے کے مطابق، یہ مادی دنیا اور اس میں موجود ہر شے، ہر رشتہ اور ہر جذبہ محض ایک سایہ، ایک دھندلا عکس اور ایک نامکمل نقل ہے۔ افلاطون کے نزدیک اصل، کامل اور بے عیب حقیقت اس خاکی دنیا یا عالمِ محسوسات سے پرے ایک اور دنیا میں واقع ہے، جسے وہ 'عالمِ امثال' یا 'عالمِ اعیان' (World of Ideas) کا نام دیتے ہیں۔ (۲) افلاطون کا استدلال تھا کہ اس دنیا میں نظر آنے والا حسن، سچائی اور محبت اپنی اصل میں ناقص اور عارضی ہیں، کیونکہ ان کا کامل، دائمی اور حقیقی نمونہ (Ideal) صرف عالمِ امثال میں موجود ہے۔ ہماری روح چونکہ اسی عالمِ اعیان سے بھٹک کر اس مادی قید خانے میں آئی ہے، اس لیے وہ لاشعوری طور پر ہر شے میں اسی 'کمال' یا 'مثالیے' کو تلاش کرتی ہے جو وہ وہاں چھوڑ آئی ہے۔ (۳) افلاطون نے اپنے اس 'نظریہ اعیان' کو مزید واضح کرنے کے لیے 'تمثیلِ غار' (Allegory of the Cave) تراشی ہے۔ وہ فرض کرتا ہے کہ کچھ انسان پیدائش سے ہی ایک تاریک غار میں زنجیروں سے اس طرح بندھے ہیں کہ ان کا رخ صرف غار کی اندرونی دیوار کی طرف ہے۔ ان کی پیٹھ کے پیچھے ایک آگ جل رہی ہے، اور اس آگ کے سامنے سے جب مختلف اشیا گزاری جاتی ہیں، تو ان کے سائے سامنے والی دیوار پر پڑتے ہیں۔ وہ قیدی، جنھوں نے کبھی غار سے باہر کی حقیقی روشنی نہیں دیکھی، ان لرزتے بے جان سایوں کو ہی حتمی اور مکمل حقیقت مان لیتے ہیں۔ (۴)

افلاطون کے نزدیک، اس دنیا کے انسانوں کی حالت بھی بعینہٖ انھی قیدیوں جیسی ہے۔ ہم حواسِ خمسہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اس مادی دنیا کے عارضی رشتوں، ادھوری مسرتوں اور فانی جذبوں کو — جو دراصل عالمِ امثال کے محض دھندلے سائے ہیں — مکمل حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر کوئی قیدی اس غار سے نکل کر باہر کی حقیقی دنیا یعنی عالمِ اعیان کے کمال اور سورج کی سچائی کو دیکھ لے، تو وہ لوٹ کر کبھی اس غار اور اس کے سایوں سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ افلاطون کی یہ سحر انگیز فکر اور مثالیت پسندی محض قدیم یونان کی سرحدوں تک محدود نہ رہی بلکہ اس نے آنے والی صدیوں کے عظیم ترین اذہان پر انمٹ نقوش ثبت کیے۔ ارسطو کی منطق اور پلوٹینس کی نو-افلاطونیت سے لے کر سینٹ آگسٹین اور تھامس ایکویناس کے الہیاتی افکار تک، ہر جگہ اسی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جب یہ فکری لہر اسلامی دنیا میں داخل ہوئی تو الکندی، فارابی، ابنِ سینا، ابنِ رشد، ابنِ طفیل اور شیخ اشراق سہروردی جیسے نابغہ روزگار فلسفیوں نے اسی مثالیت کے چشمے سے سیرابی حاصل کی۔ (۵) جدید مغربی فلسفے کا ارتقا بھی اس سے مبرّا نہ رہ سکا؛ رینے ڈیکارٹ، ایمانوئل کانٹ، جارج ولہم ہیگل، آرتھر شوپن ہار، کیرکیگارڈ، کارل مارکس اور یہاں تک کہ نطشے تک، تاریخِ افکار کے لگ بھگ تمام عظیم معماروں نے شعوری یا لاشعوری طور پر اسی نظریہ اعیان کے اثرات قبول کیے یا اس سے گہرا فکری مکالمہ کیا۔ (۶) یہ انھی بے چین، متلاشی اور کمال کے آرزومند ذہنوں کا ایک طویل اور شاندار قبیلہ تھا، جس کے خمیر میں اس کھوئے ہوئے 'مثالیے' کی کسک اور عالمِ اعیان کی یاد صدیوں تک زندہ رہی۔ فکر و فلسفے کے اس قبیلے کی ایک نمایاں اور مضطرب روح اُردو ادب کی تاریخ میں جون ایلیا کی صورت میں نمودار ہوئی۔ فلسفہ اور ادب جون کو ورثے میں ملے تھے۔ جون افلاطون سے حد درجہ متاثر تھے۔ ان کی فکری جڑیں قدیم یونانی فلسفے، اور بالخصوص افلاطونی فکر میں بہت گہرائی تک پیوست تھیں۔ جون ایلیا افلاطون کی فکری عظمت کے اس حد تک قائل تھے کہ ان کی تمام تحریروں میں جس فلسفی کا سب سے زیادہ اور متواتر ذکر ملتا ہے، وہ افلاطون ہی ہے۔ وہ ہومر اور سقراط کے ساتھ افلاطون کو یونانی دانش کی علامت مانتے تھے۔ جیسا کہ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"ہومر، سولن، تاسیس ملیٹی، سقراط، افلاطون، پروتاگورس اور ارسطو کے نام دراصل عظیم یونان کے عظیم ذہن کی علامتیں ہیں۔"(۷)

جون کا یہ پختہ یقین تھا کہ فلسفے کی کسی بھی تحریک یا ادارے کا اصل فخر وہ شجرہِ نسب ہے جو افلاطون تک پہنچتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دیکھا جائے تو یہ فرض فلسفہ کانگریس ہی پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے نمایندوں کو محسوس کرنا چاہیے کہ وہ فلسفے کے عظیم الشان ادارے سے وابستہ ہیں وہ اس تحریک سے تعلق رکھتے ہیں جس نے سقراط' برونو اور شہاب الدین مقتول کو جنم دیا جو افلاطون' ارسطو' شیخ الطائفہ فارابی' شیخ الرئیس ابنِ سینا او رابنِ رشد سے منسوب ہے۔"(۸)

معاشرتی اور سیاسی معاملات میں بھی جون افلاطون کی باتوں کو محض ایک رائے نہیں، بلکہ حتمی سند کا درجہ دیتے تھے۔ وہ افلاطون کے پیش کردہ 'فلسفی حکمران'(Philosopher King) کے تصور کے بے حد معترف تھے:

"افلاطون نے حکم رانی کو سب سے اہم مرتبہ قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ حکم راں کو حکیموں اور دانش مندوں کے گروہ سے آنا چاہیے۔ اس بھلے آدمی نے فلسفی حکم راں کا خواب دیکھا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سیاست دانوں کو حکیم اور دانش ور ہونا چاہیے۔"(۹)

لیکن بات محض فکری عقیدت اور علمی حوالوں تک محدود نہیں تھی۔ جون کا افلاطون کے ساتھ تعلق ایک شدید جذباتی اور روحانی قسم کا تھا۔ وہ اپنی کٹی پھٹی تنہائیوں کے اذیت ناک لمحوں میں افلاطون سے باقاعدہ ہم کلام ہوتے تھے۔ ان کی اس وابستگی کی شدت ملاحظہ ہو:

"میں تم سے بار بار ایک بات کہتا چلا آیا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے زیادہ دیر تک اکیلا نہ چھوڑا کرو... میں دوپہر سے لے کر ایک ساعت پہلے تک افلاطون اور ابنِ مسکویہ سے بات چیت کرتا اور آپ کی منتظری میں مبتلا رہا ہوں۔"(۱۰)

یہ ذہنی شیفتگی اس نہج پر تھی کہ جون کے نزدیک افلاطون ہونا بجائے خود انسانی مرتبے کی ایک بہت بڑی معراج تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"نشیان! مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے تم سقراط ہو اور میں تمھارا شاگرد افلاطون ہوں اور افلاطون ہونا تو بڑی بات ہے۔"(۱۱)

جون ایلیا کا یہ عشق دراصل افلاطون کی ذات سے بڑھ کر اس کے اسی 'نظریہ اعیان' (Theory of Forms / Idealism) سے تھا۔ یہ افلاطونی 'اعیان' جون کے لاشعور اور ان کے فکری خون میں اس قدر رچ بس چکے تھے کہ جب وہ اپنے بیٹے زریون کے نام اپنی مشہور نظم "درختِ زرد" لکھتے ہیں، تو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے انہیں الفاظ اور استعارے بھی افلاطون ہی کی بارگاہ سے مستعار لینے پڑتے ہیں:

دل و جاں اور آسائش یہ اک کُونی تمسخر ہے
حُمق کی عبقریت ہے، سفاہت کا تفکر ہے

حُمق کی عبقریت اور سفاہت کے تفکر نے
ہمیں تصنیع مہلے کے لیے اکوان بخشے ہیں
اور افلاطون اقدس نے ہمیں اعیان بخشے ہیں
سنو زریون تم تو عین اعیان حقیقت ہو
نظر سے دور منظر کا سر و سامان ثروت ہو (۱۲)

جون کی افلاطون کے ساتھ اس غیر معمولی فکری وابستگی اور شیفتگی کے چشم دید گواہ محض ان کی اپنی تحریریں ہی نہیں، بلکہ ان کے معاصرین اور قریبی ساتھی بھی اس حقیقت کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ جون کے ہاں افلاطونیت کا یہ رنگ اس قدر نمایاں اور غالب تھا کہ ان کے احباب انہیں اسی عظیم یونانی مفکر کے فکری تسلسل کے طور پر دیکھتے تھے۔ مشہور محقق اور ان کے ساتھی پروفیسر اظہار حیدری لکھتے ہیں:

"جون ایلیا نے افلاطون اور ارسطو کی 'اکادمی' کے طرز پر عروس البلاد کراچی میں 'ادارۂ ذہنِ جدید' کی طرح ڈالی تھی۔" (۱۳)

جون کا یہ فلسفیانہ سفر کوئی بعد ازاں اوڑھی گئی نقاب نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے لڑکپن کے ایام سے ان کے وجود اور شعور کا حصہ بن چکا تھا۔ ان کے بچپن کے دوست اور ساتھی رضی صدیقی ان دنوں کی یاد تازہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جب عام بچے کھیل کود میں مگن ہوتے، جون کا ذہن افلاطون کی آتما سے محوِ کلام ہوتا تھا:

"جس عمر میں لڑکے گلی ڈنڈا، ہاکی اور کبڈی کھیلتے تھے۔ ہم ارسطو، افلاطون اور کارل مارکس کے افکار پر گفت گو کرتے تھے۔ جون جب شروع ہوتا تھا تو تاریخِ انسانی کی تمام فکری منزلیں نظروں کے سامنے گزرنا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس کے جسم میں بڑی بے چین روح ہے اور اس کا شعور، اس کے ہوش سنبھالنے کے وقت سے مسلسل جاگ رہا ہے۔ وہ اپنے احساس کی بھٹی میں تپ تپ کر کندن بن چکا ہے۔" (۱۴)

یہی بے چین روح اور فکری وسعت جب اپنے عروج پر پہنچتی تھی تو جون کے احباب کو ان میں تاریخ کے تمام عظیم فلسفیوں اور تخلیق کاروں کا عکس بیک وقت نظر آتا تھا۔ اجمل صدیقی اسی کیفیت اور جون کے افلاطون سے اس قلبی و فکری رشتے کو نہایت خوبصورت اور جذباتی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

"وہ زبان و کلام کا آخری پیغمبر جو ابو عتاہیہ سے مراقبہ کرتا تھا، جو نیتشے اور کانٹ سے باتیں کرتا تھا، جس کی بکواس اک اقانیمی بدایت تھی، جو سرِّ طور تھا، جو ایسا کلیم تھا جس میں ہارون اور موسیٰ یک جا تھے، جو بدھ کو جانتا تھا، جو افلاطون کا یار تھا، جو فردوسی کا دوست بھی تھا اور اس کا نقاد بھی، جو شیکسپیئر کا محرم راز تھا، وہ اچانک بچہ سا بن کر آپ کے سامنے آجاتا ہے۔" (۱۵)

افلاطون سے جون کی یہ شیفتگی محض خشک فلسفیانہ مباحث، مکالمات یا اداروں کے قیام تک محدود نہیں تھی، بلکہ اس نے ان کے جذباتی اور رومانوی رویوں کو بھی پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ افلاطون کا 'نظریہ اعیان' جب محبت کے باب میں داخل ہوتا ہے تو وہ 'افلاطونی عشق' (Platonic Love) کا روپ دھار لیتا ہے۔ ایک ایسا عشق جو جسم کی کثافتوں سے ماوراہو کر محض روح کی پاکیزگی اور ایک کامل 'مثالیے' سے جڑا ہوتا ہے۔ جون ایلیا اپنی نوجوانی ہی سے اس افلاطونی عشق کے شدت سے قائل اور اس کے سحر میں گرفتار رہے۔ اپنے پہلے مجموعہ کلام 'شاید' کے دیباچے میں وہ اپنے اس ابتدائی اور معصوم رومانوی مثالیے کا ذکر نہایت دردمندی سے کرتے ہیں:

> "پلوٹینس نے ایک جگہ لکھا ہے "مجھے اِس بات پر بہت ندامت ہے کہ میں جسم میں ہو کر پایا جاتا ہوں۔" میں بھی اُس زمانے میں اِسی احمقانہ انداز میں سوچا کرتا تھا۔ میں نے اپنی افلاطونی محبت کی جو ہیکل تعمیر کی تھی، اُس میں ہر وقت لوبان اور دوسرے بخورات کی خوشبو مہکتی رہتی تھی۔"(۱۶)

یہ افلاطونی محبت دراصل اسی 'مثالیے' (Ideal) کی تلاش کی پہلی سیڑھی تھی، جس کا کامل خاکہ وہ ایک خیالی محبوبہ کی صورت میں تراش چکے تھے۔ وہ کمال، جو زمینی اور مادی حقیقتوں میں عنقا تھا، اسے وہ اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں بسائے بیٹھے تھے۔ اسی دیباچے میں وہ اپنی اس خیالی جستجو کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

> "۱۹۴۳ء میں میری عمر بارہ برس تھی۔ میں اُس زمانے میں کبھی شعر کہتا تھا، کبھی جبران خلیل کے نابالغ طرزِ احساس و خیال میں اپنی ایک خیالی محبوبہ صوفیہ کے نام خط لکھا کرتا تھا۔ وہ خط میری بیاض میں محفوظ ہوتے رہتے تھے۔ میں اُن خطوں میں اپنی افلاطونی مگر نرگسی محبت کے اظہار کے ساتھ خاص طور پر جو بات بار بار لکھتا تھا، وہ یہ تھی کہ ہمیں انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے"(۱۷)

افلاطونی عشق اور خیالی محبوبہ کا یہ رومانوی تصور محض نوجوانی کا خبط نہیں تھا، بلکہ یہ اس مثالیت پسندی (Idealism) اور تصوریت کا نقطۂ آغاز تھا جس نے جون ایلیا کی پوری زندگی، ان کے افکار اور ان کے فن کو ایک مستقل سراب میں الجھائے رکھا۔ جون کے ہاں یہ مثالیت پسندی ایک باقاعدہ نظامِ فکر کا درجہ رکھتی تھی۔ وہ مثالیت پسندوں اور دانش وروں کو معاشرے کا اصل ضمیر اور اس کی بقا کی حتمی دلیل گردانتے تھے۔ ان کے نزدیک مادی منفعت کی بنیاد پر کھڑا معاشرہ اس وقت تک درندوں کا ہجوم ہے جب تک اس میں کمال کے متلاشی یہ مثالیہ پرست موجود نہ ہوں۔ وہ پورے استدلال کے ساتھ لکھتے ہیں:

> "یہ دنیا چند انسانیت پرست اور مثالیت پسند دانش وروں کی دنیا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ وہ سماج کے رحم و کرم پر ہوں دراں حالے کہ سماج صرف ان کی حفاظت کے لیے وجود میں آیا ہے۔ اگر ضمیرِ فطرت اور سماج کے درمیان کوئی واسطہ ہے تو وہ صرف دانش ور ہیں۔ وہ سماج جس میں دانش ور موجود نہ ہوں وہ وحوش و بہائم کا سماج ہے۔ سماج کے سامنے صرف وہی معیار ہونا چاہییں جو انھوں

نے تجویز کر دیے ہیں اس لیے کہ بلندیوں اور پستیوں کے درمیان اگر کوئی معیار موجود ہے تو وہ صرف انھی کا بخشا ہوا ہے۔ واقعہ ہے کہ صدیوں سے دانش وروں اور ادیبوں کو سماج میں وہ حیثیت حاصل نہیں جو اُن کا حق ہے۔ ہمارا سماج چیزوں کی قیمت متعین کرتے وقت محض خارجی پیمانوں کو ملحوظ رکھتا ہے بل کہ عام طور پر ہر سماج کا یہی رجحان رہا ہے۔ لوگ صرف یہ بات دیکھتے ہیں کہ مادّی فائدہ کس چیز میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ طلبِ منفعت میں انتہائی عجلت پسند واقع ہوئے ہیں۔ بھلا شاعرانہ تخیّل اور فلسفیانہ دانش پژوہی سے انھیں کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ اگر ان کے بس میں ہو تو وہ غور و فکر اور تجسّس و تخیّل کو جرم قرار دے دیں۔ ایک ایسا جرم جس کی سزا موت ہے۔"(۱۸)

معاشرے کے اس سفاک اور مادی رویے کا جون کو بخوبی ادراک تھا، اور یہی وجہ تھی کہ ان کی یہ مثالیت پسندی ان کی عملی زندگی میں دنیاوی ناکامی کا ایک بہت بڑا المیہ بن کر ابھری۔ جب وہ اپنے خاندان کے دیگر نامور اور کامیاب افراد سے اپنا موازنہ کرتے ہیں، تو اپنی اس پسپائی کا اصل سبب اسی شدید خیال پسندی کو قرار دیتے ہیں:

"میری پیڑھی کے افراد کی اکثریت نے بھی اپنی قدیم ترین خاندانی عادت اور روایت کے مطابق علم' ادب اور شاعری سے اپنا رشتہ استوار کیا جیسے رئیس امروہوی' کمال امروہوی اور انٹرنیشنل فلاسفی کانگریس کے رکن فلسفی' علامہ سیّد محمد تقی۔ یہ سب کے سب کامیاب رہے' نام وری حاصل کی۔ مگر میں غریب اول جلول قسم کا آدمی بُری طرح مارا گیا اور وہ اس لیے کہ میں ان سب سے زیادہ خیال پسند' مثالیہ پرست (Idealist) اور اپنے رجحانات میں بے حد ضدی واقع ہوا تھا۔"(۱۹)

یہ اس مادیت پرست دنیا کے آگے ایک مثالیہ پرست کا اعترافِ شکست ہے۔ 'شاید' کے دیباچے کے بالکل آغاز میں وہ اپنے اس اعترافِ شکست کا تعلق اپنے فکری ورثے اور خاندانی تربیت سے جوڑتے ہوئے نہایت دردمندی سے رقم طراز ہیں:

"یہ میرا پہلا مجموعۂ کلام یا شاید پہلا اعترافِ شکست ہے جو انتیس تیس برس کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک ناکام آدمی کی شاعری ہے۔ یہ کہنے میں بھلا کیا شرمانا کہ میں رایگاں گیا۔ مجھے رایگاں ہی جانا بھی چاہیے تھا۔ جس بیٹے کو اُس کے انتہائی خیال پسند اور مثالیہ پرست باپ نے عملی زندگی گُزارنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا ہو بلکہ یہ تلقین کی ہو کہ علم سب سے بڑی فضلیت ہے اور کتابیں سب سے بڑی دولت تو وہ رایگاں نہ جاتا تو اور کیا ہوتا۔"(۲۰)

یہ تصوریت پسندی (Idealism) جون کی ذات پر اس قدر حاوی تھی کہ اس نے ان کے جمالیاتی ذوق اور نفسیات تک کے پیمانے بدل دیے تھے۔ عالم یہ تھا کہ جوانی کے ایام میں وہ بیماری اور موت تک کو ایک رومانوی اور مثالی زاویے سے دیکھتے تھے:

"میں نے اُس زمانے میں اپنے گھر میں نہ جانے کس سے کچھ اشعار سُنے تھے۔ اُن اشعار نے میرے پورے عہدِ نوجوانی میں ایک موثر مگر سخت منفی کردار ادا کیا اور مجھے کئی برس تک کے لیے راہ سے بے راہ رکھا۔ اِن اشعار میں عاشق ایک ایسا نوجوان نظر آتا ہے جس نے تپِ دِق میں خون تھوک تھوک کر جان دی ہو۔۔۔ مجھے تپِ دق کی بیماری بہت جمالیاتی، شاعرانہ، ہیروانہ اور انقلابی محسوس ہوتی تھی۔۔۔ وہ زمانہ تصوریت پسندی کا زمانہ تھا۔"(۲۱)

اور جب یہ رومانوی اور نفسیاتی تصوریت، باقاعدہ فلسفے کے میدان میں داخل ہوئی، تو جون کا واسطہ برطانوی مفکر جارج بارکلے (George Berkeley) کی 'موضوعی تصوریت' (Subjective Idealism) سے پڑا۔ بارکلے کا یہ فلسفہ کہ "کسی شے کا وجود اس کے ادراک کیے جانے میں ہے"، جون کے متلاشی اور خیال پسند ذہن کے لیے ایک عجیب فکری مشقت اور طلسم بن گیا تھا:

"میں آہستہ آہستہ فلسفے کے مطالعے میں غرق ہوتا جا رہا تھا۔ میری بدنصیبی کہ میں سب سے پہلے ایک برطانوی فلسفی سے دوچار ہوا۔ وہ تھا تصوریت پسند بارکلے۔ اُس کا کہنا یہ تھا کہ ہم شے کا اِدراک اس لیے نہیں کرتے کہ وہ پائی جاتی ہے بلکہ وہ پائی ہی اِس لیے جاتی ہے کہ ہم اُس کا اِدراک کرتے ہیں۔ یعنی اگر ہم کسی کتاب کو پڑھنے کے بعد الماری میں بند کر دیں اور وہ ہمارا معروضِ ادراک نہ رہے تو وہ یک سر معدوم ہو جائے گی اور اُس کا کائنات میں کہیں کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ یہ ایک بہت دلچسپ صورت حال تھی اور میرا خیال پسند ذہن اِس سے بے حد لطف اندوز ہوتا تھا لیکن اس لطف اندوزی کے باوجود میرا دماغ متحمل ہو جاتا تھا۔ میں الماری کھولتا اور اُس کتاب کو انتہائی ناقابل جواز طور پر موجود پاتا اور پھر الماری بند کر دیتا یعنی اُس کتاب کو دوبارہ عدم کے حوالے کر دیتا۔ یہ تصوریت پسندانہ مشقت میرے دماغ کے لیے یک سر ناقابل برداشت تھی مگر بارکلے نے اپنی انتہائی نظریاتی فراخ دلی کا ثبوت دے کر اُسے میرے لیے کسی حد تک قابل برداشت بنا دیا تھا۔"(۲۲)

اقبال حیدر جون کی شدید مثالیت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ جون ایلیا کو مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔۔۔ ایک ایسا عمیق 'مثالیہ پسند' شاعر اور خیال و وجدان کا فسوں گر، جس کے نفس نفس میں احساس، تخیل، تعقل اور جذبہ یک سر ہم آہنگ ہو کر ایک تخلیقی وحدت کی شکل اختیار کر لے، کیا وہ بھی فنا ہو سکتا ہے؟ جی نہیں۔ جو زندگی کو جواز فراہم کرے اور جو وجود کی ثنویت کا اقرار کر کے اسے خارج اور باطن میں ہمہ وقت پائندگی دے، وہ کیسے مر سکتا ہے؟"(۲۳)

فلسفیانہ اور نظریاتی تصوریت کے اس طویل اور گہرے پس منظر کے باوجود، جب ہم جون ایلیا کی نثر کا بغور مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے لفظ 'مثالیہ' (Ideal) کو اپنی نثر میں زیادہ تر اپنے عام، لغوی اور مروجہ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ نثر میں ان کے ہاں 'مثالیے' سے مراد وہ معیار، اقدار، پیمانے یا نمونے ہیں جنہیں کوئی معاشرہ، فرد یا ادارہ اپنے لیے رول ماڈل کے طور پر اپناتا ہے۔ انہیں انگریزی میں Standards کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، وہ ہمارے معاشرے کے کھوکھلے پن اور ترجیحات کے زوال پر ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہمارے معیار اور ہمارے مثالیے بہت ہی رکیک اور پست ہیں۔ ہم کسی عالم، ادیب، مفکّر، مصنف، قانون داں، شاعر، افسانہ نگار اور سائنس داں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم نقّالوں، لطیفہ گویوں، اداکاروں، مسخروں اور بے ہنگام نچنیوں اور گویوں کو اہمیت دیتے ہیں" (۲۴)

اسی طرح جب وہ سماج کے اس رجعت پسندانہ رویے پر چوٹ کرتے ہیں جو اپنے حال اور مستقبل کو سنوارنے کے بجائے محض ایک فرسودہ ماضی کو اپنا معیار بنالیتا ہے، تو وہاں بھی 'مثالیہ' کا لفظ اسی عمومی اور سماجی تناظر میں سامنے آتا ہے:

> "یہاں صرف ایک ہی معیار اور ایک ہی مثالیے کو اپنایا گیا ہے اور وہ ہے ماضی۔ ماضی کا ایک حصّہ قابلِ فخر اور ایک حصّہ قابلِ ملامت۔ ان گانٹھ کے پورے آدمیوں نے قابلِ ملامت ماضی کو اختیار کیا ہے معلوم نہیں کہ لوگ اپنے آباو اجداد کی زندگی کب تک بسر کریں گے؟" (۲۵)

ادبی تنقید کے میدان میں بھی جون جب نام نہاد نقادوں اور سستی شہرت پانے والے قلمکاروں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں، تو وہ 'مثالیے' کی اصطلاح کو 'ادبی معیار' کے مترادف کے طور پر پیش کرتے ہیں:

> "انھوں (نقادوں) نے ادب کے جو مثالیے قائم کیے وہ انتہائی ارزاں اور حقیر تھے۔ ان مثالیوں اور معیاروں پر ہر بے سر و پا پورا اُتر سکتا تھا۔ چناں چہ پچھلے بیس پچیس سال میں عظیم فنکاروں کی ایک فوج تیار ہوگئی۔ ایک ایسی فوج جو ہمارے کسی کام کی نہیں۔" (۲۶)

ان تمام نثری حوالوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جون ایلیا نے اپنی نثر میں لفظ 'مثالیہ' کو عام، سماجی اور تنقیدی معنوں میں ایک 'معیار' کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مگر نثر میں ایک سماجی اور تنقیدی پیمانے کے طور پر برتا جانے والا یہ لفظ، جب جون کی شاعری کی اقلیم میں داخل ہوتا ہے تو ابتداً اس کی بازگشت قدرے دھیمی محسوس ہوتی ہے۔ جون کے ابتدائی پانچ شعری مجموعوں میں گنتی کے چند اشعار ہی ایسے ملتے ہیں جہاں 'مثالیہ' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور وہاں بھی یہ کسی حد تک اپنے مکمل، گہرے اور حتمی علامتی مفہوم کو پوری طرح وا نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر، 'یومِ پاکستان' کے موقع پر لکھی گئی نظم میں یہ لفظ ایک قومی اور اجتماعی آدرش کے طور پر سامنے آتا ہے:

ہم نے اے سرزمیں خواب و خیال
تجھ سے رکھا ہے شوق کو پر حال

ہم نے تیری امید گاہوں میں
کی ہے اپنے مثالیوں کی تلاش(۲۷)

اسی طرح ان کے پہلے مجموعے 'شاید' کی غزلوں کے یہ متفرق اشعار دیکھیے، جہاں کمالِ مطلق کی جستجو اور اس کے نہ ملنے کا کرب تو موجود ہے، مگر یہ لفظ ابھی ایک ہمہ گیر شعری علامت کا بوجھ اٹھاتا محسوس نہیں ہوتا:

اک حسنِ بے مثال کی تمثیل کے لیے
پرچھائیوں پہ رنگ گراتا رہا ہوں میں
اپنا مثالیہ مجھے اب تک نہ مل سکا
ذروں کو آفتاب بناتا رہا ہوں میں(۲۸)

جون کروگے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش
اب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو گئے(۲۹)

مگر جون کے فکری اور شعری سفر کے ایک حیرت انگیز موڑ سے ہم ان کے آخری شعری مجموعے "کیوں" میں روشناس ہوتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل فن پاروں میں لفظ 'مثالیہ' سے قاری کا سامنا کئی بار ہوتا ہے۔ ان فن پاروں کے تناظر میں ہم لفظ 'مثالیہ' کو باقاعدہ ایک علامت کے طور پر ابھرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں "مثالیے کی تلاش" کے عنوان سے ایک قطعہ اور ۴ مثنویاں شامل ہیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی، بلکہ حیرت انگیز طور پر اسی عنوان کے تحت تین مسلسل غزلیں بھی قاری کو پڑھنے کو ملتی ہیں۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہ جون کے اس دور کی تخلیقات ہیں جب وہ مثالیت پسندی کے فکری اسیر تھے۔ جون نے اپنے ابتدائی دو شعری مجموعوں 'شاید' اور 'یعنی' میں ان تخلیقات کو کیوں جگہ نہیں دی، اس بات کا جواب تو جون ہی بہتر دے سکتے تھے۔ شاید ایک وجہ یہ ہو کہ تب تک جون اس نظریے کی قید سے آزاد ہو چکے تھے اور اس وجہ سے انہوں نے ان تخلیقات کو درخورِ اعتنانہ سمجھا۔ مجموعہ 'کیوں' میں شامل یہ تمام تخلیقات (غزلیں، مثنویاں اور قطعات) دراصل اسی کھوئے ہوئے افلاطونی آئیڈیل کی تلاش کا ایک طویل اور کرب ناک نوحہ ہیں۔ ان اشعار میں 'مثالیہ' ایک ایسے نادیدہ اور کامل محبوب کے روپ میں سامنے آتا ہے جو حقیقت کی دنیا میں کہیں وجود نہیں رکھتا، مگر جون نے اپنا پورا وجود اسی سائے کی رفاقت میں راکھ کر دیا:

ہجر کے ساتھ یا وصال کے ساتھ
خوب گزری ترے خیال کے ساتھ
میں نے اِک زندگی بسر کر دی
تیرے نادیدہ خدّ و خال کے ساتھ(۳۰)

یہ نادیدہ خدوخال دراصل اسی 'عالمِ اعیان' کا پرتو ہیں جسے وہ زمین کی خاک میں تلاشتے رہے اور تھک ہار کر اس دردناک سچائی کا اعتراف کر بیٹھے:

خواب پرور خیالیہ نہ ملا
مجھ کو میرا مثالیہ نہ ملا

دیکھ آیا ہوں پیچ و خم سارے
تیری منزل نہ مل سکی بارے(۳۱)

اس مثالیے کی تلاش انہیں تاریخ، دیومالا اور تہذیب کے ہر استعارے تک لے جاتی ہے۔ وہ اس کامل روح کو ایک مادی بدن میں ڈھونڈنے نکلتے ہیں، مگر وہ کسی چمن، کسی خطن، اور کسی شہرِ فرخار میں نہیں ملتی:

تجھ کو ڈھونڈا ترا مکاں نہ ملا
تُو مری روح، کِس بدن سے ہے؟
میری بلقیس کا سبا ہے کہاں
میرا طنّاز، کِس وطن سے ہے؟
یہ جو بھرپا ہے دل میں حشرِ خیال
تیرے نادیدہ بانکپن سے ہے(۳۲)

جب یہ سراپا خیال کی صورت مجسم ہو کر سامنے نہیں آتی، تو کمال کا متلاشی یہ شاعر زمینی رشتوں اور محبتوں میں اس کا عکس تراشتا ہے۔ مگر جب وہ خاکی انسان اس افلاطونی معیار پر پورے نہیں اترتے، تو مایوسی میں مبتلا شاعر ان ادھورے بتوں کو خود ہی توڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

آزمائے رفاقتوں کے فریب
کھائے تیری شباہتوں کے فریب
شوق کو رنگ رنگ موڑ دیے
بُت بنائے، بنا کے توڑ دیے(۳۳)

جون کا یہ کرب بالکل افلاطون کی 'تمثیلِ غار' (Allegory of the Cave) کا عملی اور شعری روپ ہے۔ جب وہ حقیقی آئیڈیل کی روشنی کی طرف بڑھتے ہیں تو اس مادی دنیا میں انہیں محض دھندلے سائے اور پرچھائیاں ہی نصیب ہوتی ہیں:

اعتبارِ نمودِ منزل سے
جادہ پیمائیاں ملیں مجھ کو
جب بھی پھیلی ترے خیال کی دھوپ
صرف پرچھائیاں ملیں مجھ کو(۳۴)

اور پھر اس تمام تر لاحاصل مسافت کے بعد وہ مقام آتا ہے جہاں شاعر اپنے اسی 'مثالیے' کے سامنے کھڑا ہو کر وہ سب سے بڑا اور حتمی وجودی سوال اٹھاتا ہے، جو آئیڈیل کی جستجو میں نکلنے والے ہر باشعور انسان کا دائمی المیہ ہے:

اے محبّت کی منزلِ مقصود!
میں ہوں موجود، تُو ہے نا موجود
سامنے میں تری نہیں بھی نہیں
کیا ستم ہے کہ تُو کہیں بھی نہیں

دل ہمہ داغ ہے، جگر خوں ہے
تُو نہیں ہے تو ذہن میں کیوں ہے(۳۵)

جون کا یہ 'مثالیہ' محض کتابی یا تجریدی نہیں تھا، بلکہ وہ اسے ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی اور مجسم محبوبہ کی صورت میں پانے کے آرزو مند تھے۔ ان کی اس شدید جمالیاتی اور رومانوی جستجو کے سب سے مستند گواہ ان کے وہ قریبی احباب اور اہلِ خانہ ہیں، جنھوں نے جون کو اس سراب کے پیچھے بھاگتے اور پھر خود کو لہولہان کرتے دیکھا۔ جون کے ذہن میں حسن کا جو خاکہ مقیم تھا، وہ اس قدر بے عیب اور کامل تھا کہ زمین کی کوئی عورت اس معیار پر پوری نہیں اتر سکتی تھی۔ ان کی بھتیجی، شاہانہ رئیس، جون کی اس شدید حسن پرستی اور ان کے ذہن میں بسی اس 'پری چہرہ' کے ناممکن خدوخال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتی ہیں:

"حقیقت یہی ہے کہ چچا جون حد درجہ حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔ اماں جیسے سنہری بال اور آنکھیں، ریحانہ باجی جیسے خوب صورت نقش و نگار، باجی امی جیسی نزاکت اور چمپئی رنگت۔ ایسی پری چہرہ لڑکی جو مسکرائے تو آسمان پر دھنک سی بکھر جائے۔ اب مشکل یہ ہے کہ ان کے دل میں بسی موہنی صورت اس دھرتی پر ملنی مشکل ہے۔"(۳۶)

جون کی یہ نفسیاتی الجھن ان کے رومانوی رشتوں میں ایک مستقل رکاوٹ بن چکی تھی۔ وہ محبت تو کرنا چاہتے تھے، بلکہ بیک وقت کئی محبتوں کے متلاشی تھے، مگر ان کا یہ 'مثالیہ' ان کے اور حقیقت کے درمیان ایک ایسی دیوار بن گیا تھا جسے وہ کبھی عبور نہ کر سکے۔ ممتاز خاکہ نگار اور نقاد عرفان جاوید، جون کے اس رومانوی المیے اور کمال کی تلاش کے انجام کو نہایت باریک بینی سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جون دنیا کی ہر لڑکی سے عشق کے آرزو مند تھے اور بہ یک وقت کئی لڑکیوں سے۔ ایسا نہیں تھا کہ انھیں موقعے نہ ملے ہوں مگر یا تو کچھ عرصے بعد وہ ہچکچانے لگتے تھے یا پیروی کے لیے وقت نہیں دے پاتے تھے یا اُن سے عشق کے پیچیدہ مطالبے، تقاضے نبھائے نہیں جاتے تھے۔ جون کو کسی مثالیے کی تلاش تھی۔ کچھ عرصے بعد اُنھیں احساس ہوتا کہ یہ تعبیر تو ان کے خوابوں، خیالوں کی ضد ہے۔ کسی کو مثالیہ نہیں ملتا اور مِل جاتا ہے تو مثالیہ نہیں رہتا۔ انھوں نے کہا تھا۔

جون کروگے کب تلک اپنا مثالیہ تلاش
اَب کئی ہجر ہو چکے، اب کئی سال ہو گئے

جون صاحب کے لیے کوئی پری بھی آسمان سے اُترتی تو وہ کچھ مدت بعد اس میں بھی عیب تلاش کر لیتے۔ کچھ اور نہیں تو جمالیاتی عیب۔"(۳۷)

اس لاحاصل تلاش نے جون کی شخصیت میں ایک عجیب سی آتشِ زیرپا کیفیت اور تنک مزاجی پیدا کر دی تھی۔ جب انسان کا ذہن کمال کے افلاطونی آسمانوں پر اڑ رہا ہو اور پاؤں زمین کی کھردری حقیقتوں پر ہوں، تو وجود کا دہکنا فطری امر ہے۔ پروفیسر اظہار

حیدری جون کی اس انوکھی افتادِ طبع کا موازنہ اُردو کے کلاسیکی اساتذہ سے کرتے ہوئے، ان کی اس کوندتی ہوئی بے قراری کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "اگلے وقتوں میں میر اور مصحفی امروہوی شاید و باید ہی جون ایلیا کی سی تمکنت، نازک مزاجی، نازک خیالی اور آتشِ زیر پا جبلت رکھتے ہیں۔ یاس یگانہ چنگیزی، نہال سیوہاروی اور سیّد حیدر دہلوی آتشِ بر سرِ سخن اور آتشِ زیر پا پگ ڈنڈیوں کی مسافرت میں رقصیدہ و لغزیدہ تھے۔ مگر جون ایلیا تنک مزاجی میں دہکتے تلووں کے ساتھ کوندتے ہوئے برقی راستوں پر اپنے تپتے ہوئے مثالیے کی تلاش میں آتشِ نور کے برق کش جھروکوں کی جانب غلطیدہ و رقصیدہ سبک خرام تھے۔"(۳۸)

یہی مثالیہ دراصل وہ بھٹی تھی جس نے جون کے تخلیقی جوہر کو کندن بنایا۔ ان کے معاصرین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر ان کے اندر یہ کسک اور بے چینی نہ ہوتی، تو شاید وہ اس پائے کے شعر نہ کہہ پاتے۔ ممتاز نقاد محمد علی صدیقی اسی نکتے کی تائید کرتے ہوئے جون کی شاعری کے اصل محرک کی نشاندہی کرتے ہیں:

> "جون ایلیا خاصے رومانوی ہیں وہ مثالیے کی تلاش میں بے حد سرگرداں رہتے ہیں۔ مثالیے کی تلاش ان کی شاعری میں ایک اہم تخلیقی محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔"(۳۹)

جون کی تمام تر شاعری اور فکری مسافت میں اگر کوئی ایک ایسا مقام ہے جہاں ان کے 'مثالیے' کا عکس پوری صراحت، شدت اور فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے، تو وہ ان کی شاہکار نظم **"نگارِ دلنشیں"** ہے۔ یہ دعویٰ قطعاً مبالغہ نہیں کہ جون ایلیا کے ہاں مثالیے کے اس پیچیدہ، نفسیاتی اور وجودی تصور کو مکمل اور بھرپور انداز میں سمجھنے کے لیے تنہا یہی ایک نظم کافی ہے۔ اس نظم میں جون کا افلاطونی المیہ اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں شاعر کا اصل مسئلہ محبوب کا نہ ملنا نہیں، بلکہ مل کر بھی اس 'مثالیے' پر پورا نہ اترنا ہے۔ نظم کے آغاز میں محبوبہ محض ایک خوبصورت زمینی وجود، ایک "نگارِ دل نشیں" اور "جمالِ جسم و جاں" ہے، جس کی محض ایک دید سے شاعر کائنات کے سارے دکھ بھول جاتا ہے۔ لیکن ایک کٹر مثالیہ پرست کا ذہن اس ادھورے زمینی کمال پر قناعت کیسے کر سکتا ہے؟ وہ اس مادی وجود کے گرد اپنے تخیل، آدرش اور تمناؤں کا ایسا طلسماتی ہالہ بنتا ہے کہ محبوب کا یہ خیالی تصور، اس کے اصل زمینی وجود سے کہیں بڑا، وسیع اور ہمہ گیر ہو جاتا ہے۔ شاعر پکار اٹھتا ہے:

تمھاری ذات اب اپنے سِوا اِک خواب ہے میرا
یہ خواب اِک بحرِ بے پایاں و ناپایاب ہے میرا(۴۰)

یہی وہ خطرناک موڑ ہے جہاں مثالیے اور زمینی حقیقت کا وہ خوفناک تصادم ہوتا ہے جو جون کے وجدان کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ شاعر کے ذہن کے آئینے میں محبوب کا جو کامل 'عکس' (Ideal) تراشا جا چکا ہے، وہ اس قدر بے عیب اور ماورائی ہے کہ اب وہ عکس خود اپنے اصل (یعنی مادی محبوب کے ناقص وجود) کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ اپنے محبوب کو محض اس کے اپنے مثالیے کی 'ہم نام' قرار دے کر، جون دراصل اپنی اس ازلی تلاش کی ناکامی کا حتمی اعلان کر دیتے ہیں۔ انہیں یہ سفاک ادراک ہو جاتا ہے کہ وہ

جس کمالِ مطلق کی جستجو میں اپنا پورا وجود خاک کر بیٹھے، وہ اس دنیا کا مقدر ہی نہیں تھا۔ یہ افلاطون کے 'عالمِ امثال' کا وہ خواب تھا جسے زمین کی کھردری حقیقتوں میں کبھی تعبیر نہیں مل سکتی تھی۔ اس اذیت ناک اور طویل فکری مسافت کے بعد، جب جون اپنی اس لاحاصل تلاش کے آخری سرے پر پہنچتے ہیں، تو ایک تھکے ہارے مثالیہ پرست کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا۔

حوالہ جات

1. Whitehead, A. N. Process and Reality: An Essay in Cosmology. Macmillan,1929, (p. 63).
2. Plato.The Republic (A. Bloom, Trans.). Basic Books. 1991,p. 186–189). Stephanus pagination: Book VI, 507b–509c
3. 3. Plato.Phaedo (G. M. A. Grube, Trans.). In J. M. Cooper (Ed.), Plato: Complete Works, 1997, (p. 49–100). Hackett Publishing Company. (Specific reference: pp. 64–68 [Stephanus pagination: 72e–77a]).
4. 4. Plato, The Republic (A. Bloom, Trans.). Basic Books, 1991, (p. 193–197). [Stephanus pagination: Book VII, 514a–520a].
5. Adamson, P. Philosophy in the Islamic World: A History of Philosophy Without Any Gaps (Vol. 3). Oxford University Press, 2016, p. 26–32, 63–76, 113–139, 179–193, 316–328, 386–399, 434–441).
6. Tarnas, R. The Passion of the Western Mind: Understanding the Ideas That Have Shaped Our World View. Ballantine Books.,1991, (p. 41–44, 98–106, 341–354, 378–394, 395–410).

۷۔ جون ایلیا، فرنود، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۱۰۳

۸۔ ایضاً، ص:۱۴۲

۹۔ ایضاً، ص:۴۹۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۶۱۱

۱۱۔ ایضاً، ص:۶۳۸

۱۲۔ جون ایلیا، یعنی، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۲

۱۳۔ پروفیسر اظہار حیدری، شاید ترے جینے کی ادا لے گئی تجھ کو، مشمولہ میں یا میں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۱۰۶

۱۴۔ رضی صدیقی، جون ایلیا، مشمولہ میں یا میں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۳۰۳-۳۰۴

۱۵۔ اجمل صدیقی، جون ہی تو ہے جون کے درپے، مشمولہ میں یا میں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۵۳

۱۶۔ جون ایلیا، شاید، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص:۱۸

۱۷۔ ایضاً، ص:۲۱-۲۲

۱۸۔ جون ایلیا، فرنود، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۱۰۵-۱۰۶

۱۹۔ ایضاً، ص:۴۳

۲۰۔ جون ایلیا، شاید، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص:۱۱

۲۱۔ ایضاً، ص:۱۹

۲۲۔ ایضاً، ص:۲۶

۲۳۔ اقبال حیدر، جونِ سوختہ جاں، مشمولہ میں یا میں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۱۲۸

۲۴۔ جون ایلیا، فرنود، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۵۷۱

۲۵۔ ایضاً، ص:۲۰۲

۲۶۔ ایضاً، ص:۱۱۴

۲۷۔ جون ایلیا، شاید، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، ص:۸۳

۲۸۔ ایضاً، ص:۱۰۶

۲۹۔ ایضاً، ص:۱۶۰

۳۰۔ جون ایلیا، کیوں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ص:۲۸۰

۳۱۔ ایضاً، ص:۲۸۱

۳۲۔ ایضاً، ص:۲۸۲

۳۳۔ ایضاً، ص:۲۸۲-۲۸۳

۳۴۔ ایضاً، ص:۲۸۶

۳۵۔ ایضاً، ص:۲۸۶

۳۶۔ شاہانہ رئیس، شاخِ ویراں کا مغنی، مشمولہ میں یا میں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء ص:۴۱۵

۳۷۔ عرفان جاوید، جون صاحب، مشمولہ میں یا میں، لاہور الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۴۹۸-۴۹۹

۳۸۔ اظہار حیدری، پروفیسر، شاید ترے جینے کی ادا لے گئی تجھ کو، مشمولہ میں یا میں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص۱۰۹

۳۹۔ محمد علی صدیقی، آشوبِ آگہی کا شاعر، مشمولہ میں یا میں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۶۲۱

۴۰۔ جون ایلیا، کیوں، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص:۲۷۵

References in Roman Script

1. Whitehead, A. N., Process and Reality: An Essay in Cosmology, Macmillan, 1929, p. 63.
2. Plato, The Republic, translated by A. Bloom, Basic Books, 1991, pp. 186–189. Stephanus pagination: Book VI, 507b–509c.

3. Plato, Phaedo, translated by G. M. A. Grube, in J. M. Cooper (ed.), Plato: Complete Works, Hackett Publishing Company, 1997, pp. 49–100; specific reference: pp. 64–68. Stephanus pagination: 72e–77a.
4. Plato, The Republic, translated by A. Bloom, Basic Books, 1991, pp. 193–197. Stephanus pagination: Book VII, 514a–520a.
5. Adamson, P., Philosophy in the Islamic World: A History of Philosophy Without Any Gaps, Vol. 3, Oxford University Press, 2016, pp. 26–32, 63–76, 113–139, 179–193, 316–328, 386–399, 434–441.
6. Tarnas, R., The Passion of the Western Mind: Understanding the Ideas That Have Shaped Our World View, Ballantine Books, 1991, pp. 41–44, 98–106, 341–354, 378–394, 395–410.
7. Jaun Elia, Farnood, Lahore, Al-Hamd Publications, 2012, p. 103.
8. Ibid., p. 142.
9. Ibid., p. 492.
10. Ibid., p. 611.
11. Ibid., p. 638.
12. Jaun Elia, Yaani, Lahore, Al-Hamd Publications, 2014, p. 182.
13. Professor Izhar Haideri, “Shayad Tere Jeene Ki Ada Le Gayi Tujh Ko,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, p. 106.
14. Razi Siddiqui, “Jaun Elia,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, pp. 303–304.
15. Ajmal Siddiqui, “Jaun Hi To Hai Jaun Ke Dar Pay,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, p. 53.
16. Jaun Elia, Shayad, Lahore, Al-Hamd Publications, 1990, p. 18.
17. Ibid., pp. 21–22.
18. Jaun Elia, Farnood, Lahore, Al-Hamd Publications, 2012, pp. 105–106.
19. Ibid., p. 43.
20. Jaun Elia, Shayad, Lahore, Al-Hamd Publications, 1990, p. 11.
21. Ibid., p. 19.
22. Ibid., p. 26.
23. Iqbal Haider, “Jaun-e-Sokhta Jaan,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, p. 128.
24. Jaun Elia, Farnood, Lahore, Al-Hamd Publications, 2012, p. 571.

25. Ibid., p. 202.
26. Ibid., p. 114.
27. Jaun Elia, Shayad, Lahore, Al-Hamd Publications, 1990, p. 83.
28. Ibid., p. 106.
29. Ibid., p. 160.
30. Jaun Elia, Kyun, Lahore, Al-Hamd Publications, n.d., p. 280.
31. Ibid., p. 281.
32. Ibid., p. 282.
33. Ibid., pp. 282–283.
34. Ibid., p. 286.
35. Ibid., p. 286.
36. Shahana Raees, “Shaakh-e-Veeran Ka Mughanni,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, p. 415.
37. Irfan Javed, “Jaun Sahib,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, pp. 498–499.
38. Professor Izhar Haideri, “Shayad Tere Jeene Ki Ada Le Gayi Tujh Ko,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, p. 109.
39. Muhammad Ali Siddiqui, “Aashob-e-Aagahi Ka Shair,” in Main Ya Main, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, p. 621.
40. Jaun Elia, Kyun, Lahore, Al-Hamd Publications, 2020, p. 275.